© rasailojaraid.com

مولانا عبید اللہ سندھی
ایک تبصرہ پر تبصرہ

(۴)

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایم اے ریڈر عربی دہلی یونیورسٹی

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قومیت سے ہماری مراد نیشنلزم نہیں ہے جس کی وجہ سے قومی عصبیت کا نشو و نما ہوتا ہے اور ایک قوم اپنے مقابلہ میں دوسری قوموں کو حقیر و ذلیل سمجھتی ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس معنی کے اعتبار سے اسلام قومیت کا شدید دشمن ہے۔ اور خود مولانا سندھی بھی اس نیشنلزم کے قائل نہیں ہیں، جیسا کہ موصوف کے ان ارشادات سے واضح ہوتا ہے جو "وحدتِ انسانیت" کے زیر عنوان نقل ہوئے ہیں۔

قومیت سے مراد وہ عادات و خصائل ہیں جو کسی ایک جماعت کا شعار بن گئے ہوں اور ان کی وجہ سے وہ جماعت دوسری جماعتوں یا قوموں کے مقابلہ میں ممتاز سمجھی جاتی ہو دوسرے لفظوں میں قومیت کو قومی مزاج سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ مولانا سندھی کا دعویٰ ہے اور بالکل بجا ہے کہ اسلام قومی مزاج کا لحاظ رکھتا ہے چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ کا ارشاد ہے۔

وقد صح ان لعادات القبیلۃ	اور یہ بے شبہ درست ہے کہ قبیلہ کی عادتوں
واوضاع البلد دخلا تاما فی	اور شہر کے حالات کو تشریع میں پورا دخل
التشریع وھذا اسرّ قول العامۃ	ہوتا ہے اور یہی راز ہے اس قول عام کا کہ شریعت
الشریعۃ تختلف باختلاف الزمان	زمان و مکان کے اختلاف سے مختلف
والمکان ومثل ذالک کمثل	ہو جاتی ہے اس کی مثال بارش کی سی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

المطر ينزل من السماء صافيا لطيف الطبع ثم يتداخل فيه بعد الوقوع على الارض فلا يستوي ماء غدير الاقاليم الاول والثاني ۔ ۱؎

جو آسمان سے بالکل صاف اور لطیف طبع ہو کر نازل ہوتی ہے پھر زمین پر پڑنے کے بعد اس میں ہوا اور زمین کا اثر سرایت کر جاتا ہے اور اس وجہ سے اقالیم اول وثانی کے تالابوں کا پانی یکساں نہیں ہوتا۔

اسلام اور عاداتِ عرب اگر عرب قبل از اسلام کے قومی مزاج اور اسلامی احکام دونوں کا مطالعہ ساتھ ساتھ کیا جائے تو یہ حقیقت الم نشرح ہو جاتی ہے کہ اسلامی احکام کی تشریع میں عربوں کے قومی مزاج اور ان کے عادات و امیال کا لحاظ کہاں تک رکھا گیا ہے۔ اس چیز کو لکھا تو اوروں نے بھی ہے لیکن حضرت شاہ صاحب دہلویؒ نے اس پر نہایت سیر حاصل بحث کی ہے جس کے جستہ جستہ اقتباسات ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

ولذلك كان الطيب والخبيث في المطاعم مفوضا الى عادات العرب ولذلك حرمت بنات الاخت علينا دون اليهود فانهم كانوا يعدونها من قوم ابيها لا مخالطة بينهم وبينها ولا ارتباط ولا اصطحاب فهي كالاجنبية بخلاف العرب ولذلك كان طبخ العجل في لبن امه حراما عليهم دوننا۔ ۲؎

اسی وجہ سے کھانوں میں حلال و حرام عرب کے عادات کے سپرد تھا اور اسی وجہ سے بھانجی ہم لوگوں کے لئے حرام ہے یہود کے لئے حرام نہ تھی کیونکہ یہود بھانجی کو اس کے باپ کی قوم میں سے سمجھتے تھے اور اپنے اور اس کے درمیان کوئی ارتباط و علاقہ نہیں مانتے تھے وہ مثل اجنبی عورت کے ہوتی تھی۔ بخلاف عربوں کے۔ اسی طرح بچھڑے کا اس کی ماں کے دودھ میں پکانا یہود میں حرام تھا۔ ہم پر نہیں۔

۱؎ تفہیمات الٰہیہ ج ۲ ص ۲۳۔ ۲؎ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۷۰۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک اور جگہ اسلام اور یہودیت ونصرانیت کے اختلاف اور اس کے اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

ومنها ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعث ببعثة تتضمن بعثة اخری فالاولی انما کانت الی بنی اسماعیل وھو قولہ تعالیٰ ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم وقولہ تعالیٰ لتنذر قوما ما انذر اباءھم فھم غافلون۔ وھذہ البعثة تستوجب ان یکون مادة شریعتہ ما عندھم من الشعائر وسنن العبادات ووجوہ الارتفاقات اذ الشرع انما ھو اصلاح ما عندھم لا تکلیفھم بما لا یعرفونہ اصلا ونظیرہ قولہ تعالیٰ قرآنا عربیا لعلکم تعقلون وقولہ تعالیٰ لو جعلناہ قرآنا اعجمیا لقالوا لولا فصلت آیاتہ ااعجمی وعربی وقولہ تعالیٰ وما

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایک اور بعثت کو شامل ہے، آپ کی پہلی بعثت صرف بنو اسماعیل کی طرف تھی اور یہی مفاد ہے اللہ تعالیٰ کے قول کا کہ وہ خدا وہ ہے جس نے امیوں میں انھیں میں سے ایک رسول معبوث کیا نیز خدا کا ارشاد ہے " تاکہ آپ ان لوگوں کو ڈرائیں جن کے باپ دادا انہیں ڈرائے گئے اور اس وجہ سے وہ غافل ہیں، بعثت کی یہ قسم اس بات کو واجب کرتی ہے کہ اس رسول کی شریعت کا مادہ وہی شعائر، عبادت کے طریقے اور ارتفاقات ہوں - جو اس رسول کی قوم میں رائج تھے کیونکہ شرع کا مقصد صرف لوگوں کی عادتوں اور طریقوں کی اصلاح ہوتا ہے کہ جن سے وہ مانوس ہوتے ہیں نہ یہ کہ ان کو ان امور کی تکلیف دی جائے جن کو وہ قطعاً جانتے ہی نہ ہوں۔ اس کی نظیر قرآن مجید کا ارشاد ہے " ہم نے قرآن کو عربی زبان میں اتارا ہے تاکہ تم سمجھو" نیز فرمایا گیا " اگر ہم قرآن کو عجمی زبان میں اتارتے تو لوگ کہتے کہ آیات الٰہی کی تفصیل کیوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ارسلنا من رسول	نہیں کی گئی یہ کیا بات ہے کہ رسول عربی ہو اور قرآن
الا بلسان قومہ والثانیۃ	عجمی" علاوہ بریں خدا کا ارشاد ہے" ہم جب کسی رسول
کانت الی جمیع اہل	کو بھیجتے ہیں تو اس کی قوم کی زبان کے ساتھ ہی بھیجتے
الارض عامۃ۔	ہیں اور دوسری قسم بعثت کی یہ ہے کہ آپ تمام اہلِ
لہ	زمین کی طرف مبعوث کئے گئے ہیں۔

پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے "اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم" کے عنوان سے حجۃ اللہ البالغہ میں جو باب باندھا ہے اس میں اسی مسئلہ کو نہایت صاف لفظوں میں مفصلاً بیان کیا ہے چنانچہ پہلے تمام انبیاء کرام کے طریق اصلاح وتشریح کا تذکرہ فرماتے ہیں کہ نبی اپنی قوم میں مبعوث ہو کر جائزہ لیتا ہے کہ ان لوگوں کے ہاں کھانے پینے کے طور طریقے کیا ہیں۔ پہننے اوڑھنے کے اداب کیا ہیں۔ زینت کن چیزوں سے کرتے ہیں۔ نکاح اور زن وشوئی تعلقات کے لئے کن باتوں پر عمل کرتے ہیں۔ خرید و فروخت۔ سزا۔ مقدمات کا فیصلہ وغیرہ ان معاملات میں ان کے اصول کیا ہیں؟ اگر یہ سب معاملات ٹھیک طریقہ پر ہو رہے ہوں تو پھر ان میں سے کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹانے کے معنی ہی کچھ نہیں اور اب نہ اس کی ضرورت ہے کہ اس کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کو اختیار کیا جائے۔ بلکہ اس کے برعکس اس صورت میں تو قوم کو اس پر برانگیختہ کیا جائیگا کہ وہ اپنے ہاں کی رسوم کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہیں لیکن ہاں اگر یہ اداب واطوار، اور یہ رسوم ومعاملات درست نہ ہوں بلکہ فاسد ہوں اور ان سے کسی کو تکلیف پہنچتی ہو، یا لذاتِ دنیوی میں انہماک کا اور احسان سے اعراض کا باعث ہوں یا انسان کو ایسی چیزوں میں مبتلا کر دیں جو اس کو دنیا اور آخرت کی بھلائیوں سے غافل کر دے تو اب ان حالات میں قوم کے ان رسوم و آداب کو بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس وقت نبی قوم کو اُن چیزوں کی دعوت نہیں دیتا جو ان کی مالوف عادتوں سے بالکل متبائن ہو، بلکہ ان چیزوں کی طرف بلاتا ہے جو خود قوم کی یا

لہ حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۹۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے مشہور و مسلم صلحاء کی مالوف عادتوں سے ملتی جلتی اور ان کی نظیر ہوتی ہیں۔ ایک راسخ فی العلم جانتا ہے کہ نکاح، طلاق، معاملات، تجمل و زینت، لباس، قضا اور حدود اور تقسیم غنائم ان سب میں شریعت کوئی ایسی بات نہیں کہتی جس کا لوگوں کو پہلے سے علم نہ ہو یا جب ان کو ان احکام کا مکلف کیا جائے تو وہ ان میں تردد کرنے لگیں۔[۱]

انبیاء کرام کے طریقِ دعوت سے متعلق یہ ایک اصولی بات بیان کرنے کے بعد شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ

"عبدالمطلب کے زمانہ میں خون بہا دس اونٹ تھا لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ لوگ اس کے باوجود قتل سے باز نہیں آتے تو انھوں نے اونٹوں کی تعداد سو تک پہنچا دی، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے بھی دیت میں یہی تعداد باقی رکھی اسی طرح عرب میں قوم کے سردار کو لوٹ کے مال میں سے چوتھا حصہ ملتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غنیمت کا پانچواں حصہ مقرر فرمایا۔ قباذ اور انوشیرواں نے لوگوں پر خراج اور عشر مقرر کر رکھا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو قائم رکھا بنو اسرائیل زانی کو رجم کرتے تھے، سارق کا ہاتھ قطع کرتے تھے، قاتل کو قتل کرتے تھے تو قرآن میں بھی یہی احکام نازل ہوئے۔"

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں۔

وامثال هذه كثيرة جداً	اس کی مثالیں بہت کثرت سے ہیں تلاش
لا تخفى على المتتبع[۲]	کرنے والے پر مخفی نہیں ہیں۔

پھر بر سبیل ترقی ارشاد ہوتا ہے۔

بل لو كنت فطناً محيطاً بجوانب	بلکہ اگر تم سمجھدار اور جوانب احکام کا احاطہ کئے
الاحكام لعلمت ايضاً ان الانبياء	ہوئے ہوگے تو تم کو معلوم ہوگا کہ انبیاء کرام

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۸۲ و ۸۳۔ [۲] ،، ص ۸۱۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علیہما السلام لم یأتوا فی العبادات	عبادات میں بھی وہی چیزیں لاتے ہیں جو بعینہا
غیر ما عندھم ھو او نظیرہ لکنھم	خود موجود ہوتی ہیں یا ان کی مماثل ہوتی ہیں، البتہ
نفوا تحریفات الجاھلیۃ وضبطوا	ہاں! وہ جاہلیت کی تحریفات کی نفی کر دیتے ہیں
بالاوقات والارکان ماکان	اور اوقات اور ارکان جو مبہم ہوتے ہیں ان کو
مبہماً ۔ [1]	منضبط کرتے ہیں ۔

تحویلِ قبلہ | تحویلِ قبلہ کے باب میں اختلاف ہے کہ یہ دو مرتبہ ہوا تھا یا ایک مرتبہ۔ بہرحال ایک مرتبہ کی تحویل پر تو سب کا اتفاق ہے ہی۔ حضرت شاہ صاحبؒ اس کی حکمت بیان کرتے ہیں کہ:۔

"ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام اور جنھوں نے ان کا دین قبول کر لیا تھا وہ سب کعبہ کو قبلہ مانتے تھے لیکن اسرائیل علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے بیت المقدس کی طرف اپنا رخ کرتے تھے۔ پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے اور آپ کو اوس اور خزرج (مدینہ کے دو قبیلے) اور ان کے یہودی حلیفوں کی تالیفِ قلب منظور ہوئی اور یہی لوگ آپ کی امداد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ وہ امت بنے جو انسانوں کے لئے نمونہ کے طور پر بنائے گئے تھے اور ان کے برخلاف مضر کا قبیلہ اور ان کے دوسرے حلیف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین دشمن اور آپ کے سب سے زیادہ دور ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد کیا اور آپ نے بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیدیا کیونکہ قربات (عبادات) کے اوضاع میں۔ اصل یہ ہے کہ رسول اس قوم کے احوال کی رعایت کرے جس میں وہ مبعوث ہوا ہے اور جو قوم اس کی مدد کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی ہے اور جو انسانوں کے لئے شہدا ہیں۔ اس وقت مدینہ میں ان صفات کے حامل اوس اور خزرج کے ہی لوگ تھے اس لئے ان کی رعایت رکھی گئی۔ پھر اللہ نے اپنی آیات کو مستحکم کر دیا اور اپنے نبی کو اس چیز کی اطلاع دی

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۸۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو اس مصلحت سے بھی عمدہ مصلحت کے ساتھ زیادہ موافق تھی اور اس کی صورت یہ کی کہ سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں استقبال کعبہ کے حکم کی تمنا پیدا کر دی۔ چنانچہ آپ آسمان کی طرف دیکھا کرتے تھے کہ شاید جبریل امین اس حکم کو لیکر آرہے ہوں، اس کے بعد قرآن مجید میں تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہوا۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امیوں میں مبعوث ہوئے جو ملّتِ اسماعیلیہ پر قائم تھے اور اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ یہی لوگ اس کے دین کی مدد کرینگے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ کے شہدار لوگوں کے حق میں یہی ہوں گے اور یہی آپ کے خلفار آپ کی امت میں ہوں گے۔ ان کے برخلاف یہود میں سے بہت تھوڑے ہی لوگ ایمان لائیں گے پھر کعبہ عربوں کے نزدیک اللہ کے شعائر میں سے تھا جس کی عظمت کا یقین قریب کے اور دور کے سب عرب کرتے تھے اور ان کے ہاں پہلے سے کعبے کے استقبال کا طریقہ رائج تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر اس کے کوئی معنیٰ ہی نہ تھے کہ کعبہ سے عدول کیا جاتا" لہ

لہ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۱۰۲

ایک عام خیال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اس وقت عرب بالکل جاہل تھے دین اور مذہب سے ان کو کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اخلاق و آداب سے یہ بالکل ناآشنا اور نابلد تھے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ محض عامیانہ خیال ہے حضرت شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ جلد اول میں "ماکان علیہ حال اهل الجاهلیۃ فاصلحہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے زیر عنوان ایک مستقل باب باندھا ہے اور بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ بعثت سے پہلے ان کے ہاں عبادات بھی تھے اور معاملات کے لئے خاص خاص اصول اور آئین و آداب بھی مقرر تھے اس باب کا مطالعہ کیجئے اور اسلام کے ایک ایک حکم کو ان چیزوں پر منطبق کرتے چلے جائیے تو معلوم ہوگا کہ اسلام نے عربوں کی کتنی چیزوں کو علیٰ حالہا قائم رکھا۔ کتنی چیزوں کو بالکل ساقط کیا اور کن کن رسوم و ارتفاقات میں کیا کیا اور کس کس طرح اصلاحیں کیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گفتگو ایک نازک اور اہم مسئلہ پر ہو رہی ہے اس لئے آپ حضرت شاہ صاحب کی ان مذکورہ بالا عبارتوں کو بڑی احتیاط اور غور و توجہ سے پڑھئے اور پھر بتائیے کہ کیا ان کا صاف صاف اور کھلا مطلب یہ نہیں ہے کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ اولیٰ عرب کی طرف تھی اور آپ اسی قوم کو ایک نمونہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے تاکہ اس طرح آپ کی بعثتِ عامہ کا مقصد پورا ہو۔ اس بنا پر عام انبیاء و رسل کے طریقِ دعوت و تشریع کے مطابق اسلام کے احکام و مسائل کی تشریع میں عربوں کے عادات و اطوار، ان کے رسوم و ارتفاقات اور ان کے قومی رجحانات و عوائد کا لحاظ رکھا گیا۔ یہاں تک کہ حدود و عقوبات، معاشرت کے آداب و اصول میں بھی انھیں کی رعایت کی گئی۔

قبلہ کا معاملہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ اس میں بھی کس طرح ان لوگوں کی رعایت رکھی گئی جن کے درمیان سرورِ کائنات علیہ التحیۃ والصلوات اس وقت تشریف رکھتے تھے۔ چنانچہ اکثر علماء کے قول کے مطابق جب تک آپ مکہ میں رہے کعبہ کی طرف استقبال کرتے رہے۔ پھر مدینہ کی سرزمین کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے رشکِ فردوس و غیرتِ جنان بنا دیا تو (اوس اور خزرج کی تالیفِ قلب کے لئے) بیت المقدس کو قبلہ بنا لیا اور جب بنو اسماعیل کو غلبہ حاصل ہو گیا تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کے مطابق آخری اور قطعی طور پر کعبۃ اللہ کے قبلہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

علاوہ بریں قومی مزاج کی رعایت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ شراب خباثتوں کی جڑ ہے اور اسلام میں قطعی حرام ہے لیکن اس کے باوجود چونکہ یہ کمبخت ایک مرتبہ منہ کو لگنے کے بعد آسانی سے چھٹتی نہیں ہے اور عرب کے لوگ اس کے صرف رسیا ہی نہیں تھے بلکہ شراب نوشی کو لازمۂ سخاوت و شرافت سمجھتے تھے اس لئے اس کو یکایک حرام قرار نہیں دیا گیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ۸ھ میں یعنی وفاتِ نبوی سے صرف دو سال پہلے اس کی قطعی حرمت کا اعلان کیا گیا[۵۱]۔

---

[۵۱] اس سلسلہ میں حضرت عائشہ رضؓ کی وہ روایت بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے جس میں آپ نے اس قدر تاخیر سے حرمتِ خمر [illegible] حکمت بیان فرمائی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حالانکہ مردار چیز، خون اور خنزیر کی حرمت کا اعلان اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا کیونکہ یہ چیزیں خود عربوں کے قومی مزاج کے خلاف تھیں۔

پس اب اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی تردد نہیں ہونا چاہئے کہ حدود و قربات تحلیل و تحریم اطعمہ اور اوضاعِ لباس وغیرہ میں عربوں کی قومیت یعنی ان کے قومی مزاج کی پوری رعایت کی گئی ہے۔ اب اس کے ساتھ آپ لائق ناقد کے اس بیان پر توجہ فرمایئے کہ "اسلام قومیتوں کے نقطۂ نگاہ سے سوچتا ہی نہیں" تو آپ کو خود بخود معلوم ہو جائیگا کہ یہ دعویٰ کس درجہ بے بنیاد اور اس بنا پر ناقابلِ قبول ہے۔ اربابِ منطق جانتے ہیں سالبہ کلیہ کی نقیض موجبہ جزیہ ہوتی ہے ہم نے جب یہ ثابت کر دیا کہ اسلام کے احکام کی تشریح میں عربوں کی قومیت کو بہت بڑا دخل ہے تو لائق ناقد کا دعویٰ جو سالبہ کلیہ کا حکم رکھتا ہے خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام نے عرب قومیت کو فنا نہیں کیا بلکہ اس قومیت کی ترکیب میں جو عناصر فاسدہ تھے اُن کی اصلاح فرمائی۔ ان کو مہذب اور شائستہ بنایا اور جو عناصر کہ صالح تھے ان کو قائم رکھا اور جن اجزا میں عدم توازن پایا جاتا تھا ان کو متوازن کیا اور ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب بحیثیت ایک قوم کے دنیا کی سب سے بہتر قوم اور اعلیٰ انسانیت کا ایک پیکر اتم بن گئے۔ یہاں تک کہ وہ آسمانِ انسانیت کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر اس شان اور اس آن بان سے چمکے کہ تاریخ شرف و مجد کا صفحہ صفحہ ان کی ضوباریوں سے مطلع انوار بن گیا۔ ان کی عرب قومیت، عربی مزاج عربی افتادِ طبع اور عربی خصوصیات مٹی نہیں بلکہ ایک بہترین شکل میں منتقل ہو کر اور قومیتِ صالحہ کے قالب میں ڈھل کر زندۂ جاوید ہو گئیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

آج اگرچہ وہ خود اس دنیا میں نہیں ہیں اور مدتیں ہوئیں کہ ان کا جسم خاکی پیوندِ زمین ہو گیا لیکن تاریخ کے اوراق پر ایمانِ صدیقی، دبدبۂ فاروقی، فقر بوذری، شجاعت حیدری اور حلم وحیاءِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عثمانی کے جو نقش ثابت ہیں اب بھی چشم تصور سے دیکھو تو ان بزرگوں کی ارواحِ طیبہ ان نقوش کی طرف غیر محسوس و غیر مرئی اشارے کر کر کے پکار رہی ہیں۔

تلک اٰثارنا تدل علینا فانظروا بعدنا الی الاٰثار

بتاؤ یہ سب نقوش کس کے ہیں؟ ایک بہترین عرب قوم کے ہی ہیں یا کسی اور کے؟ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

موضوعِ بحث کا دوسرا رُخ | لیکن یہ بحث یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ تمام احکام عربوں کے عادات و خصائل کے مطابق ہی مشروع کیے گئے ہیں تو پھر یہ عالمگیر کیسے ہوئے؟ کیا یہ ناانصافی نہیں ہے کہ چند احکام ایک خاص قوم کے مزاج کے مطابق بنائے جائیں اور تمام دنیا کو ان کی پیروی کی دعوت دی جائے؟ اس سوال کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بجائے عرب کے کسی اور ملک اور کسی اور قوم میں ہوتی تو کیا اس وقت بھی اسلام کے احکام کی نوعیت یہی ہوتی یا کوئی اور؟ اگر اس وقت بھی اسلام کے یہی احکام ہوتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تشریعِ احکام میں عرب قومیت کا تو ضرور لحاظ رکھا گیا ہے، لیکن اس کے علاوہ دوسری قومیتوں کی رعایت بالکل نہیں ہے۔"

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے سب سے پہلے بہ طور مقدمہ یہ جان لینا چاہئے کہ تشریع میں کسی قوم کے عادات و خصائل کو جو دخل ہوتا ہے تو اس سے مراد مطلق عادات و خصائل نہیں ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی عبارتوں سے کسی کو یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہئے کہ آج مثلاً یورپ کی قوموں میں شراب نوشی، خنزیر خوری، مردوں اور عورتوں کا مخلوط رقص اور ان کا مخلوط اجتماع اس قدر عام ہے کہ یہ سب چیزیں یورپین اقوام کے قومی مزاج کے عناصر ترکیبی بن گئے ہیں تو اب ان اقوام کے لئے تشریع احکام میں ان چیزوں کی بھی رعایت ہونی چاہئے۔ خوب اچھی طرح یاد رکھئے کہ حضرت شاہ صاحب جہاں قومی عادات و اطوار کو تشریع میں دخیل مانتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ آپ نے یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ ان عادات سے مراد ہر قسم کی بری بھلی عادات نہیں ہیں بلکہ عادات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مختلف قسم کی ہوتی ہیں بعض شرمحض ہوتی ہیں اور بعض خیر محض۔ اور بعض ایسی ہوتی ہیں جن میں خیر اور شر دونوں کا امتزاج ہوتا ہے۔ اب جب نبی آتا ہے تو وہ شرمحض عادتوں کو یک قلم ترک کردینے کی اور ان کے بالمقابل خیرمحض عادتوں کو مضبوطی اور پابندی سے اختیار کر لینے کی دعوت دیتا ہے اب رہیں تیسری قسم کی عادات تو ان میں جو حصہ خیر کا ہوتا ہے اس کو باقی رکھا جاتا ہے اور حصہ شر کی اصلاح کردی جاتی ہے[1]۔

بہر حال یہ اصول جو کچھ تھا اسلام سے پہلے تک کے لئے تھا۔ اب اسلام نے آکر تمام اچھی اور بری چیزوں کا قطعی فیصلہ کردیا ہے۔ حلال اور حرام دونوں کو صاف صاف بیان کردیا گیا ہے اور جو حدود وغیرہ متعین کردیئے گئے ہیں وہ سب کے لئے ہیں اور ہر زمانہ کے لئے ہیں اسلام کا شارع (صلی اللہ علیہ وسلم) آخری شارع تھا۔ اب اس کے بعد کسی شخص کو حقِ تشریع حاصل نہیں ہے۔

لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ چونکہ شریعتِ اسلام ہر قوم اور ہر زمانہ کے لئے ہے اور اب نبی آخرالزماں کے بعد کوئی اور نبی کسی نئی شریعت کے ساتھ آنیوالا نہیں ہے اس بنا پر اس شریعتِ مصطفوی میں تمام قوموں کے عادات وخصائل کی رعایت پہلے سے ہی رکھی گئی ہے تاکہ ہر قوم اس کو آسانی سے اپنا سکے"۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ شریعتِ اسلام میں بعض چیزیں حلال ہیں اور بعض حرام، بعض مکروہ ہیں اور بعض مباح۔ اسی طرح کچھ فرائض وواجبات ہیں اور کچھ مستحبات ومندوبات، اب اگر ان تمام احکام کا تجزیہ کیا جائے اور ان کا منشا حکم جس کو اصولِ فقہ کی اصطلاح میں مناط کہتے

---

[1] حضرت شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں متعدد مقامات پر اور خصوصاً ارتفاقات کے اقسام وانواع کی بحث کے ذیل میں ان عادات کا تذکرہ کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ہے کہ تشریع میں جن عادات کا دخل ہوتا ہے۔ وہ بدمعاشوں اور لفنگوں کی عادتیں نہیں ہوتیں بلکہ اسی قوم کے صلحاء کی عادتیں ہوتی ہیں جو اس قوم میں شرافت و نیکی کا دارومدار سمجھی جاتی ہیں۔ اگر بدمعاشوں کا کوئی گروہ ان سے مجتنب ہوتا ہے تو وہ اپنی کثرت کے باوجود سب کی نظروں میں بدمعاش ہی ہوتا ہے۔ انھیں چیزوں کو قرآن مجید نے اعمالِ صالحہ سے تعبیر کیا ہے اور ان اعمال کی فرداً فرداً تفصیل نہیں کی۔ کیونکہ دنیا کے تمام اچھے آدمی جانتے ہیں کہ نیک اعمال کون سے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، دریافت کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان احکام کی تشریع میں دو قسم کی عادتوں کا دخل ہے ایک وہ عادات ہیں جو تمام قوموں میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہیں۔ یا بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ تمام قوموں کے صلحاء ان عادتوں کے متعلق یکساں رویہ رکھتے ہیں اور دوسری نوع کی عادات وہ ہیں جو عرب قوم کے ساتھ مخصوص تھیں حضرت شاہ صاحبؒ نے ان دونوں عادات کا تذکرہ کیا ہے پھر ان میں آگے چل کر جو فرق پیدا ہو جاتا ہے اس کو بھی بیان کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

واعلم ان کثیرا من العادات	اور جانو کہ بہت سی عادتیں اور جذبات پنہاں
والعلوم الکامنۃ یتفق فیہا	ایسے ہیں کہ عرب اور عجم اور تمام معتدل
العرب والعجم وجمیع سکان	اقالیم کے رہنے والے اور اخلاق فاضلہ کی
الاقالیم المعتدلۃ واھل	قابلیت رکھنے والے مزاجوں کے لوگ ان میں
الامزجۃ القابلۃ للاخلاق	متفق ہوتے ہیں۔ مثلاً میت کے لئے غمگین ہونا
الفاضلۃ کالحزن لمیتہم و	اور اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنے کو محبوب
استحباب الرفق بہ الخ	جاننا۔

اس کے بعد ارشاد حق بنیاد ہے۔

ذالک العادات والعلوم احق	یہ عادات و احساسات تمام چیزوں میں سب سے
الاشیاء بالاعتبار۔	زیادہ قابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔

عادات کی یہ ایک قسم بیان فرمانے کے بعد دوسری قسم کا تذکرہ کرتے ہیں۔

ثم بعدھا عادات وعقائد	پھر ان عادات کے بعد دوسری عادتیں اور عقائد
تختص بالمبعوث الیہم	بھی ہوتے ہیں جو مبعوث الیہم کے ساتھ مخصوص
فیعتبر تلک ایضاً [1]	ہوتی ہیں ان کا بھی اعتبار کیا جاتا ہے۔

ایک اور مقام پر اور زیادہ وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ا ۷ ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واذا كان كذالك وجب ان	اور جب صورت یہ ہو تو اب ضروری ہے کہ ایسے
تكون مادة شريعته هو بمنزلة	نبی کی شریعت کی اساس وہ ہونی چاہئے جو تمام
المذهب الطبيعي لاهل	اقالیم صالحہ کے لوگوں کے لئے بمنزلہ مذہب طبیعی ہو
الاقاليم الصالحة عربهم وعجمهم	پھر خود اس کی قوم کے پاس جو علم اور ارتفاقات
ثم ما عند قومه من العلم والارتفاقات	ہوتے ہیں وہ بھی اس نبی کی شریعت کا اساس
ويراعي فيه حالهم اكثر من	ہوتے ہیں اور اس میں نبی اپنی قوم کے احوال کی
غيرهم ثم يحمل الناس جميعا	رعایت دوسروں کی بہ نسبت زیادہ کرتا ہے پھر تمام
على اتباع تلك الشريعة [1]	لوگوں کو اس شریعت کی پیروی کی دعوت دیتا ہے۔

اب آپ کہیں گے کہ حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہ ونور ضریحہٗ کے مذکورۂ بالا بیان کے مطابق جب شریعتِ اسلام کا قوام بین الاقوامی عادات کے ساتھ ساتھ خاص عرب کے عادات سے بھی تیار ہوا ہے تو جہاں تک پہلی عادات کا تعلق ہے اسلام کا عالمگیر ہونا مسلم لیکن دوسری نوع کے عادات کے پیشِ نظر جو احکام مشروع کئے گئے ہیں ان کو کس طرح تمام قوموں کے لئے لازم کیا جائے۔ تو لیجئے! حضرت شاہ صاحبؒ نے خود ہی اس دغدغہ کو بھی دفع کر دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

فلا احسن ولا ايسر من ان	اس سے اچھی اور آسان کوئی اور بات نہیں ہوتی کہ
يعتبر في الشعائر والحدود	شعائر اور حدود اور ارتفاقات میں یہ نبی اپنی قوم
والارتفاقات عادة قوم المبعوث	کی عادت کا ہی اعتبار کرے جس میں وہ مبعوث ہوا ہو
فيهم ولا يضيق كل التضييق	اور ان چیزوں میں دوسرے لوگ جو بعد میں آئیں،
على الآخرين الذين ياتون	اور جن پر یہ احکام فی الجملہ باقی رہیں گے ان پر
بعد ويبقى عليهم في الجملة [2]	زیادہ تنگی نہ کی جائے۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۹۳۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہر مسلمان جانتا ہے کہ حدود اور شعائر کا اسلام میں کیا مرتبہ ہے اور ان کو کیا اہمیت حاصل ہے لیکن اس کے باوجود حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ احکام اولین کی طرح آخرین پر بھی فی الجملہ قائم تو ضرور رہیں گے لیکن دوسرے لوگوں پر (جو خود اسی قوم کے ہوں یا کسی اور قوم کے) ان حدود و شعائر کے بارہ میں حد سے زیادہ تنگی نہ کی جائے۔

اس حقیقت کی توضیح کے لئے چند مثالیں پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں چوری کی سزا قطع ید بیان کی گئی ہے ارشاد ہے۔

السارق والسارقۃ — چور مرد اور چور عورت دونوں کے
فاقطعوا ایدیھما — ہاتھ کاٹ دو۔

یہ حکم مطلق ہے کسی قید کے ساتھ مقید نہیں۔ پھر قطع ید کا جو حکم اس سے مستنبط ہو رہا ہے وہ عبارت النص سے مستنبط ہو رہا ہے جس میں کوئی ابہام اور اغلاق، اجمال اور گنجلک نہیں ہے لیکن با ایں ہمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص حالات میں سارق پر حد سرقہ فوراً جاری کرنے سے منع فرمایا ہے چنانچہ ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ میں قطع ید کرنے سے منع فرمایا ہے۔

مگر خیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو شارع تھے حضرت عمر فاروقؓ نے تو قحط سالی کے دنوں میں سرقہ کی حد بالکل ہی ساقط کر دی تھی۔ ارشاد ہوا۔

لا تقطع الید فی عذق — درخت کے بارہ میں اور بھوک کے دنوں میں
ولا عام سنۃ [۱] — چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔

امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ بھی اس کے قائل ہیں؟ تو فرمایا" ہاں! جب کوئی شخص ضرورت سے مجبور ہو کر چوری کرے اور لوگ سختی اور بھوک سے دوچار ہوں تو چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے" [۲]

---

[۱] اعلام الموقعین ج ۳ ص ۷، ۸ [۲] ایضاً ص ۸۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور سنئے! حضرت عمرؓ نے یہی نہیں کیا بلکہ ایک دفعہ تو سارق پر حدِ سرقہ جاری کرنے کے بجائے چوری کے مال کی دگنی قیمت ادا کرنے کا آپ نے حکم دیا" اصل واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں نے قبیلہ مزینہ کے ایک شخص کی اونٹنی چرالی۔ ان غلاموں کو حضرت عمرؓ کے پاس لایا گیا تو انھوں نے چوری کا اقرار کرلیا۔ امیر المومنین نے کثیر بن الصلت کو حکم دیا کہ جاؤ ان غلاموں کے ہاتھ کاٹ ڈال۔ کثیر جب قطع ید کے ارادہ سے غلاموں کے قریب ہوا تو حضرت عمرؓ نے ان غلاموں کو واپس لوٹا دیا اور فرمایا" بخدا! اگر مجھکو یہ بات معلوم ہوتی کہ تم لوگ غلاموں کو بھوکا رکھتے ہو، یہاں تک کہ ان میں سے اگر کوئی غلام بھوک سے مجبور ہوکر کسی حرام چیز کو کھالے تو وہ اس کے لئے حلال ہو۔ تو البتہ میں ان غلاموں کے ہاتھ قطع کردیتا مگر اب میں ایسا نہیں کرونگا اور اس چوری کی سزا میں اے حاطب (جس کے غلاموں نے چوری کی تھی) اب میں تجھ سے ایک ایسا تاوان دلواؤں گا جو تجھ کو بڑا دکھ پہنچائیگا" اس تقریر کے بعد حضرت عمرؓ مزنی (جس کی اونٹنی چوری ہوئی تھی) کی طرف متوجہ ہوئے اور دریافت فرمایا کہ اونٹنی کی قیمت کا اندازہ کیا ہے؟ مزنی بولا" چار سو" اب امیر المومنین نے غلاموں کے آقا حاطب سے فرمایا" جا! مزنی کو آٹھ سو درہم ادا کر" [1]

حد سرقہ کی طرح قرآن مجید میں زنا کی جو حد (رجم) بیان کی گئی ہے وہ بھی اس معاملہ میں ایک نص قطعی ہے جس میں کوئی ابہام اور خفا نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود حضرت عمرؓ کے پاس چند اشخاص ایک فربہ اندام عورت کو پکڑ کر لائے جو گدھے پر سوار تھی اور روتی جاتی تھی، ان لوگوں نے شہادت دی کہ اس عورت سے زنا کا فعل صادر ہوا ہے۔ حضرت عمرؓ کے سوال پر عورت نے اقرار کرلیا کہ بیشک اس سے زنا کیا گیا ہے مگر اس طرح کہ وہ زانی کو پہچانتی بھی نہیں کہ وہ کون تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر عورت کو بری کردیا اور فرمایا۔

---

[1] اعلام الموقعین حافظ ابن قیم ج ۳ ص ۸ -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لو قتلت هذه لخشیت — اگر میں اس عورت کو سنگسار کر دیتا تو مجھ کو اندیشہ تھا کہ

علی الاخشبین النار — ابو قبیس اور احمر دونوں پہاڑوں میں آگ لگ جاتی۔

پھر آپ نے اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ مختلف شہروں کے حاکموں اور امیروں کو ہدایت کر دی کہ

ان لا تقتل نفس دونی[1] — میری اجازت کے بغیر کوئی شخص قتل نہ کیا جائے۔

اب ایک طرف حدود کی اہمیت پیش نظر رکھئے اور یہ دیکھئے کہ قرآن مجید میں ان کا بیان کس قدر صاف و صریح ہے۔ اس باب میں نص قطعی ہے۔ مطلق ہے، کسی قید سے مقید نہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی شخص پر لفظ سارق یا لفظ زانی کا اطلاق کیا جاسکے تو اس سے قطع نظر کہ اس نے جرم سرقہ و زنا کا ارتکاب کن حالات میں کیا ہے۔ بہر حال اس پر سرقہ اور زنا کی حد جاری ہونی چاہیے اور دوسری جانب حضرت عمرؓ کے اس اجتہاد اور حکم کو ملحوظ خاطر رکھئے۔ اس کے ساتھ ہی فقہاء کا یہ کلیہ کہ

الحدود تندرء بالشبہات — حدود شبہات سے ساقط ہو جاتی ہیں۔

کو بھی فراموش نہ کیجئے تو آپ کو صاف معلوم ہو گا کہ حدود اللہ کے نص قطعی اور نا قابل تغیر ہونیکے باوجود ان کے اجراء و تنفیذ کے معاملہ میں ایک امیر المومنین کے اختیارات کس درجہ وسیع ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے جس طرح ایک خاص مصلحت کے باعث ان حدود کا اجرا نہیں کیا۔ اسی طرح اگر کوئی اور امیر المومنین اسی نوع کی یا اس سے بھی کسی اہم مصلحت کی بنا پر حد کو بالکل جاری نہ کرے یا اس کو موخر کر دے۔ یا اس کی جگہ کوئی اور تعزیر (ہنگامی اور وقتی طور پر) مقرر کرے تو اسلام کی شریعت کے رو سے ان سب امور کا اس کو اختیار ہو گا۔

یاد ہو گا حضرت شاہ صاحبؒ نے حدود و شعائر کے بیان کے بعد فرمایا تھا کہ

"بعد میں آنے والے لوگوں پر فی الجملہ یہ حدود باقی تو رہیں گے لیکن اس معاملہ میں اُن پر زیادہ تنگی نہ کی جائے۔"[2]

---

[1] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۱۵۳۔ [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۹۴۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا احکام کی روشنی میں حضرت شاہ صاحبؒ کے اس ارشاد پر غور کیجئے تو صاف معلوم ہوگا کہ بعد میں آنیوالے لوگوں پر حدود کے معاملہ میں زیادہ تنگی نہ کرنے کا کیا مطلب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص اچھا خاصہ کھاتا پیتا ہے، خوشحال ہے، تندرست اور توانا ہے اور پھر اس کے باوجود لوگوں کا محفوظ مال ان کے گھروں میں نقب لگا کر چرا لیتا ہے، یا ایک شخص شادی شدہ ہے اس کی بیوی تندرست ہے اور اس کے باوصف وہ زنا کرتا ہے اور اس بے حیائی سے کرتا ہے کہ چار معتبر اور ثقہ آدمی یکساں الفاظ میں اس کمبخت کے متعلق زنا کی شہادت بہم پہنچا دیتے ہیں تو بے شبہ یہ دونوں شخص انتہا درجہ کے خبیث الفطرت ہیں، ان کا وجود سوسائٹی کے لئے سخت ضرر رساں ہے۔ اب ان کے آپ ہاتھ کاٹئے، سنگسار کیجئے، یا تلوار سے ان کا سر قلم کر دیجئے۔ بہرحال کوئی شریف انسان ان کے ساتھ ہمدردی نہ کرے گا اور اس وقت ان حدود اللہ کا نفاذ کسی غیر مسلم کے دل میں بھی اسلام سے توحش کا سبب نہ ہوگا۔ لیکن اگر صورتِ حال یہ نہیں ہے تو پھر امام کو غور کرنا چاہیئے کہ جرم کا سبب کیا تھا؟ اس کی نوعیت کیا تھی؟ اس پر حد جاری کرنے سے دوسرے لوگوں پر اسلامی قانون کے متعلق کیا اثر پیدا ہو سکتا ہے؟ ان سب امور کو پیشِ نظر رکھکر امام کو مجرم کے لئے کوئی سزا تجویز کرنی چاہیے۔ قرآن میں جو حدود اللہ کا بیان ہے تو حضرت عمرؓ کے حکم۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشاد کی روشنی میں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب کسی شخص پر مطلقاً سارق یا زانی کا لفظ بولا جاسکے تو زمان و مکان کے احوال و مقتضیات کا جائزہ لئے بغیر اندھا دھند اس پر حد سرقہ و زنا جاری کردی جائے۔ پس جب حدود میں بھی "لچک" کا یہ عالم ہے تو دوسرے شعائر (اکل و شرب، لباس و تزین وغیرہ) اور ارتفاقات میں اس کا کیا حال ہوگا آپ خود اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

سنن عادیہ یہی وجہ ہے کہ سنن میں ایک مستقل قسم سننِ عادیہ کی ہے یعنی وہ اعمال جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کی دیکھا دیکھی بعض صحابہ نے محض عادۃً کئے ہیں۔ یا حضرت شاہ صاحبؒ کے لفظوں میں عرب اور رعب میں بھی قریش ہونے کی بنا پر کئے ہیں وہ تمام امت کے لئے لازم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ دین کے احکام میں تحریف کے اسباب پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ومن اسباب التحریف التعمق	تحریف کے اسباب میں سے ایک سبب تعمق ہے
وحقیقتہ ان یامر الشارع	اس کی حقیقت یہ ہے کہ شارع کسی امر کا حکم
بامر وینھی عن شیٔ فیسمعہ	کرتا ہے یا کسی چیز سے وہ منع کرتا ہے تو ایک شخص
رجل من امتہ ویفھمہ حسبما	اس کو سن کر اپنے ذہن کے مطابق اس کا ایک
یلیق بذھنہ فیعدی الحکم الی	مفہوم متعین کر لیتا ہے اور اب وہ اس حکم کو اس
ما یشاکل الشیٔ بحسب بعض	سے ملتی جلتی چیز کی طرف متعدی کر دیتا ہے۔ یہ
الوجوہ او بعض اجزاء العلۃ	مشاکلت بعض وجوہ کی بنا پر ہوتی ہے۔ بعض اجزاء
او الی اجزاء الشیٔ ومظانہ و	علت کی، یا اجزاء شی اور اس کے دواعی ومقتضیات
دواعیہ وکلما اشتبہ علیہ الامر	کی بنا پر ہوتی ہے۔ اور جب اس شخص پر معاملہ
لتعارض الروایات التزم	مشتبہ ہو جاتا ہے روایات کے تعارض کی وجہ سے
الاشد ویجعلہ واجبا ویحمل کل	تو یہ سب سے زیادہ شدید اور سخت چیز کا التزام کر لیتا
ما فعلہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم	ہے اور ہر وہ کام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے
علی العبادۃ والحق انہ فعل اشیاء	کیا ہو اس کو عبادت پر محمول کرتا ہے حالانکہ حق یہ ہے
علی العادۃ فیظن ان الامر والنھی	کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد چیزیں بر سبیل
شملا ھذہ الامور فیجھر بان	عادت کی ہیں یہ شخص گمان کرتا ہے کہ امر اور نہی
اللہ تعالیٰ امر بکذا ونھی عن کذا۔	ان امور کو بھی مشتمل ہیں اور اب وہ اعلان کرتا ہے
[1]	کہ اللہ نے اس کا حکم کیا ہے اور اس سے روکا ہے۔

قرآن کا اساسِ تشریع اب ذرا اس پر غور فرمائیے کہ قرآن مجید کا اساس تشریع کیا ہے؟ یعنی اس نے جو احکام مشروع کئے ہیں تو ان کی بنیاد کیا ہے؟ تاریخ التشریع الاسلامی کے مصنف

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۹۵۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محمد الخضری رقمطراز ہیں[۵۱] کہ اس تشریع کی اساس تین چیزیں ہیں (۱) تنگی میں نہ ڈالنا (۲) تکلیف یعنی فرائض کا کم رکھنا۔ (۳) تدریجی طور پر احکام کا مشروع کرنا۔ پہلی چیز کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے۔

یرید اللہ ان یخفف عنکم	اللہ ارادہ کرتا ہے کہ تم پر تخفیف کرے اور
وخلق الانسان ضعیفاً	انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے۔

لا یکلف اللہ نفساً	اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کی وسعت کے مطابق
الا وسعہا۔	ہی تکلیف دیتا ہے۔

تقلیل فرائض کی دلیل یہ ہے کہ ارشاد ربانی ہے۔

یاایھا الذین امنوا لا تسألوا	اے ایمان لانیوالو ان چیزوں کے متعلق سوال مت کرو
عن اشیاء ان تبد لکم تسؤکم	جو اگر ظاہر ہوں تو تم کو بری معلوم ہوں

اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حج کی نسبت ایک سوال کا جواب دینے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ جن چیزوں کو میں نے ذکر نہیں کیا ہے تم بھی ان کی نسبت سوال مت کرو کیونکہ تم سے پہلے جو قومیں ہلاک ہوئی ہیں وہ کثرتِ سوال اور اپنے پیغمبروں کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے ہی ہوئی ہیں"۔ [۵۲]

حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے اور اس پر ایک اور روایت کا بھی اضافہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا مجرم مسلمان وہ شخص ہے جس کے سوال کی وجہ سے کوئی چیز حرام کی گئی ہو"۔ [۵۳]

اس فرمانِ نبوی کے مطابق بہت سی چیزیں ہیں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا ہے اور بعد میں علماءِ اسلام نے حسب موقع و مصلحت ان کے متعلق احکام وضع کئے

---

[۵۱] تاریخ التشریع الاسلامی ص ۱۴۔ [۵۲] ایضاً ص ۱۲۔ [۵۳] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۷۲۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور فتوے دیئے ہیں۔ فقہ کی اصطلاح میں ان مسائل کو مصالح مرسلہ کہتے ہیں۔ امام مالک بن انس رح اس کے لئے خاص طور پر مشہور ہیں۔

تشریع اور تنفیذ و تبلیغ | اس موقع پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ تشریع جو کچھ ہونی تھی وہ ہو چکی یعنی جو چیزیں حلال ہونی تھیں وہ حلال ہو گئیں اور جن کو حرام ہونا تھا وہ حرام کر دی گئیں۔ اب الیوم اکملت لکم دینکم کے اعلان اور شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وفات کے بعد کسی شخص کو حق نہیں ہے کہ وہ کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرے لیکن ہاں تبلیغ اور تنفیذ احکام کا معاملہ ہمیشہ مسلمانوں کے امیر و امام کے ہاتھ میں رہیگا۔ اب امیر و امام کے لئے موقع ہے کہ جس طرح تشریعِ احکام عرب قوم کے قومی رجحانات اور ان کے امیال و عواطف کو ملحوظ رکھکر کی گئی ہے اسی طرح وہ ان احکام کی تبلیغ و تنفیذ بھی اس قوم کے عادات و خصائل کو پیشِ نظر رکھکر کرے اور الاھم فالاھم کا اصول مرعی رکھے۔

اس سلسلہ میں اس واقعہ کا ذکر کر دینا کافی ہوگا کہ مکہ کی فتح کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ میں تغیر و تبدل کرنے اور اس کو وضع ابراہیمی کے مطابق ہی کر دینے کا ارادہ فرمایا لیکن چونکہ اہلِ قریش نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی اور فتنہ نہ کھڑا ہو جائے۔ اس لئے آپ نے باوجود چاہنے کے ایسا نہیں کیا۔

حافظ ابنِ قیم رح نے اپنے استاد شیخ الاسلام حافظ ابنِ تیمیہ رح کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ تاتاریوں کے زمانہ میں ایک مرتبہ شیخ الاسلام اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ایسے لوگوں کے پاس سے گذرے جو شراب پی رہے تھے۔[1] شیخ الاسلام کے ساتھیوں میں سے بعضوں نے ان کو روکنا چاہا تو آپ نے فرمایا "ایسا مت کرو کیونکہ اللہ نے شراب کو اس لئے حرام کیا ہے کہ وہ اللہ کی یاد اور نماز سے روکتی ہے لیکن ان ظالموں کو تو شراب لوگوں کو قتل کرنے، لوٹ مار کرنے اور عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرنے سے غافل کر دیتی ہے اس لئے ان کو اسی حالت میں رہنے دو۔"[2]

---

[1] غالباً یہ لوگ غیر مسلم ہوں گے۔ [2] اعلام الموقعین ج ۳ ص ۳۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سبحان اللہ امام عالی مقام حافظ ابن تیمیہؒ نے کیا خوب بات کہی ہے کہ شراب جوام الخبائث ہے اگر ایک ظالم وجابر شخص اس سے بدمست ہو کر ظلم اور سفاکی سے تھوڑی دیر کے لئے غافل ہو جاتا ہے تو کس طرح مظلوم اور غریب انسانوں کے لئے وہی رحمت بن جاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تشریع کی طرح احکام کی تبلیغ اور ان کی تنفیذ میں بھی کس طرح حکمتِ عملی کو کام میں لانا چاہیے۔ حافظ ابن قیم نے تو اپنی مشہور کتاب اعلام میں ایک مستقل اور نہایت طویل باب ہی باندھا ہے جس کا عنوان ہے "تغیر الفتوی واختلافها بحسب تغیر الازمنة والامكنة والاحوال والنیات والعوائد" اور مندرجۂ بالا واقعہ اسی باب میں نقل کیا ہے۔

خلاصۂ بحث | اب اوراقِ گذشتہ میں آپ نے جو کچھ ملاحظہ فرمایا ہے اس سب کو ایک مرتبہ ذہن میں مستحضر کیجئے تو حاصل یہ نکلیگا۔

(۱) شعائر، حدود اور ارتفاقات کی تشریع میں خاص طور پر عاداتِ عرب کا اور عموماً بین الاقوامی عادات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

(۲) جن چیزوں میں خاص عرب کی عادات اور ان کے ارتفاقات کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ اگرچہ لازم تو فی الجملہ سب پر ہیں لیکن ان کے اجراء اور تنفیذ میں زیادہ تنگی نہ کی جائے اور امام کو اختیار ہو کہ زمان ومکان کے اقتضار کے مطابق ان کی تنفیذ کرے۔

(۳) بہت سی سنن سننِ عادیہ ہیں جو تمام امت پر لازم نہیں ہیں۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے امور سے سکوت فرمایا ہے اور علماء وفقہا نے ان کیلئے حسب مصلحتِ شرعی احکام وضع کئے ہیں۔

(۵) جس قوم میں تبلیغ کی جائے اور جس پر احکامِ خداوندی نافذ کئے جائیں۔ تشریع کی طرح اس تبلیغ اور تنفیذ دونوں میں اس قوم کے قومی مزاج کی رعایت ہونی چاہیے تاکہ وہ احکامِ الٰہی سُنتے ہی متوحش نہ ہوں بلکہ رفتہ رفتہ وہ ان کو اپناتے رہیں یہاںتک کہ آخر اللہ کے رنگ میں بالکل ہی رنگے جائیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۶) زمان ومکان اور احوال وعوائد کے اختلاف سے احکام اور فتاویٰ بھی متغیر ہو جاتے ہیں۔

ان تنقیحاتِ ستہ کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام میں عبادات اور اس کے نظامِ اخلاق کے علاوہ نظامِ سلطنت اور نظامِ معاشرت میں کتنی لچک ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خلیفہ کے انتخاب اور سلطنت کی نوعیت کے لئے کوئی خاص اور مخصوص ومتعین طریقہ نہیں ہے خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ کو جمہور نے منتخب کیا۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کو خود خلیفہ اول نے تنہا چُنا اور اپنا قائم مقام بنایا۔ اور خلیفۂ دوم نے اپنی جانشینی کے لئے چھ بزرگوں کی ایک کمیٹی بنائی اور ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنانے کی سفارش کی۔ پھر امیر معاویہؓ نے بزورِ شمشیر خلافت حاصل کی تو اُسے بھی تسلیم کرلیا گیا اور اس کے بعد ولی عہدی کی داغ بیل ڈالی گئی تو مسلمان اسے بھی برداشت کر گئے۔

یہی حال نظامِ معاشرت کا ہے۔ مسلمان عرب میں رہے تو عربی وضع قطع اور عربی لباس میں نظر آتے ہیں۔ پھر اس ملک سے قدم باہر نکالا اور ایرانیوں سے میل جول بڑھا تو اس شدت کے ساتھ ایرانی تہذیب وتمدن کو اپنایا کہ بغداد کے بہت سے محلات پر قصرِ نوشیرواں وکاخِ مدائن کا دھوکا ہونے لگا۔ مامون رشید کے محل میں بے تکلف نوروز منایا جاتا تھا اور خود بھی اس میں شریک ہوتا تھا۔ یہ اثر آج تک چلا آرہا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے نام جہاں عبداللہ اور عبدالرحمان ہوتے ہیں۔ جمشید علی۔ فیروز بخت۔ فریدوں جاہ اور گلدادو گلزار خاں وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ پس جس طرح ایک ایران کا مسلمان، مسلمان ہونے کے باوجود اپنی ملکی زبان (جو آتش پرستوں کی زبان ہے) میں بول سکتا ہے اپنا نام ایرانی ہی رکھ سکتا ہے۔ ایرانی طریق بود وباند، اور ایرانی معاشرت پر بشرطیکہ وہ اسلام کے کسی اخلاقی اصول سے متصادم نہ ہو قائم رہ سکتا ہے تو بے شبہ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے لئے بھی یہ تمام گنجائشیں اور وسعتیں ہونی چاہئیں اور یہ ظاہر ہے کہ انہی وسعتوں اور گنجائشوں کے باعث ایک ملک کے مسلمان کی قومیت فنا نہیں ہوتی بلکہ قائم رہتی ہے مگر مہذب وشائستہ اور اسلامی اخلاق کے سانچہ میں ڈھلکر ہموار واستوار اور صالح ہو کر قائم رہتی ہے۔ جب اسلام نے عربوں کو مسلمان ہونے کے بعد عرب قومیت سے خارج نہیں کیا بلکہ ان کی قومیت کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باقی رکھا چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک جگہ صحابۂ کرام کا جو وصف بیان کیا ہے تو لکھا ہے کہ ان میں حمیتِ دینی کے ساتھ حمیت نسبی بھی تھی[1]" ایرانیوں کو مسلمان ہونے کے باوصف ایرانیت سے الگ نہیں کیا تو ہندوستان یا کسی اور ملک کے مسلمانوں کو مسلمان ہونے کے بعد کس طرح ان کی قومیت سے خارج کرسکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو بتایا جائے کہ زبان و مکان کے اختلاف سے حدود میں عدم تضییق۔ سننِ عادیہ کا عدم لزوم مصالح مرسلہ کی فقہی اہمیت۔ یہ تمام چیزیں کیوں اور کس لئے ہیں؟

اب جبکہ نبوت ختم ہوچکی ہے اور کوئی نبی کسی نئی شریعت کو لیکر کسی ملک میں آنے والا نہیں ہے تو اس صورت میں اسلام تمام دنیا کا دین اور ایک عالمگیر مذہب اسی شکل میں ہوسکتا تھا کہ اس میں وہ تمام چیزیں ہوتیں جو آپ تنقیحات ستہ میں ملاحظہ فرما چکے ہیں اور اس طرح اس میں اتنی لچک ہوتی کہ دنیا کی مختلف قومیں اپنی اپنی قومیتِ صالحہ پر قائم رہتے ہوئے اس کو اپنا سکیں۔ ہم نے "موضوع بحث کا دوسرا رخ" کے زیرِ عنوان جو سوال قائم کیا تھا۔ اس تقریر سے خود بخود اس کا جواب بھی نکل آتا ہے اور یہ واضح ہوجاتا ہے کہ قومیتوں کی رعایت سے مذکورۂ بالا امور میں گنجائش کا ہونا ہی درحقیقت اسلام کی عالمگیری کا راز ہے۔

اس طویل بحث کے بعد قومیت سے متعلق مولانا عبیداللہ سندھی کے ارشادات پڑھئے تو آپ کو ماننا ہوگا کہ مولانا نے صرف اتنی ہی اور اسی قدر بات کہی ہے جو ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ اس سے تجاوز کرکے انھوں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ کسی قوم کی رعایت سے اسلام کی حلال کی ہوئی چیز حرام یا حرام کی ہوئی شے حلال ہوسکتی ہے چنانچہ سب سے پہلے تو وہ قومیت کی تقسیم کرتے ہیں۔ صالحہ اور غیر صالحہ۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

> اسلام قومیتوں کا انکار نہیں کرتا وہ قوموں کے مستقل وجود کو تسلیم کرتا ہے اس میں وہ صالح اور غیر صالح قومیت کا امتیاز کرتا ہے۔" (ص ۱۹۶)

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۹۴۔ باب الحاجۃ الی دین ینسخ الادیان۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر جیسا کہ ہم نے شروع میں ہی لکھا ہے اس کی بھی تصریح کر دیتے ہیں کہ قومیت سے مراد نیشنلزم نہیں ہے جس سے عصبیت پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

"وہ قومیت جو بین الاقوامیت کے منافی ہو وہ اس کے (اسلام کے) نزدیک بیشک مذموم ہے" (ص ۱۹۶)

بلکہ قومیت سے مراد یہ ہے کہ جس طرح اسلام قبول کرنے کے بعد ایک عرب عرب ہی رہتا ہے۔ اور اسلام اس پر نکیر نہیں کرتا۔ ٹھیک اسی طرح ایک ترکی۔ ایک ایرانی۔ ایک افغانی۔ ایک افریقی۔ ایک یورپین اور ایک ہندوستانی مسلمان ہونے کے بعد بھی ترکی ایرانی افغانی افریقی یورپین اور ہندوستانی ہی رہتا ہے۔ کوئی دوسری چیز نہیں بن جاتا۔ اسلام اس قومیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس قومیت کے جو اجزائے صالحہ ہیں ان کی تہذیب کرتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں۔

"لیکن یہ کہ قوم کا وجود ہی سرے سے نہ رہے یہ ناممکن ہے" (ص ۱۹۶)

اب یہ بھی سُن لیجئے کہ قومیت کی رعایت سے مولانا کے نزدیک اسلام اپنے اندر کتنی لچک رکھتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

"انسان کی جبلی استعداد اس کے خاص ماحول سے ہی بنتی ہے۔ مثلاً ہندوستان میں فطرۃً ذبح حیوانات پسندیدہ نہیں۔ اس لئے اگر کوئی ہندوستانی ذبح حیوانات سے بچے تو اس کا یہ فعل خلافِ نبوت نہ ہوگا" (ص ۲۵۵)

فرمائیے! اس میں مولانا نے کونسی بیجا بات کہی ہے۔ کیا اسلام اس کا مطالبہ کرتا ہے کہ آج اگر کوئی ہندو مسلمان ہو جائے تو کلمہ پڑھوانے کے بعد پہلا کام یہ کیا جائے کہ گائے کے گوشت کی ایک بڑی بوٹی اس کے منہ میں ٹھونس دی جائے۔ حاشا وکلا۔ غور کیجئے ہندو مذہب چونکہ تنگ اور صرف ہندوستان کے لئے تھا اس لئے اس نے دوسری قوموں کے عادات کا لحاظ کئے بغیر صرف اپنے ملکی عادات کے پیشِ نظر گوشت کو قطعاً حرام قرار دیدیا۔ لیکن اسلام عالمگیر مذہب ہے۔ ہر قوم کی اس میں رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے اس لئے اس نے ایک طرف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گوشت کو حلال قرار دیا اور دوسری جانب اس کے نہ کھانے کو معصیت نہیں کہا اور آج کل کے مسلمانوں کی تغلیط کے لئے جو گوشت خوری اور ذبح حیوانات کو ہی عینِ اسلام سمجھتے ہیں اور جن کے مسلمان ہونے کی آج کل یہی ایک نشانی رہ گئی ہے یہ بھی اعلان کر دیا۔

لن ینال اللہ لحومھا ولا — اللہ کو ہرگز ہرگز نہ ان قربانیوں کا گوشت پہنچتا ہے
دماءُھا ولکن ینالہ التقوی — اور نہ ان کا خون۔ اس کو تو صرف تمہاری پرہیزگاری
منکم۔ — پہنچتی ہے۔

افسوس ہے کہ فاضل ناقد نے اس موقع پر بھی تبصرہ نگارانہ دیانت کا کوئی اچھا ثبوت نہیں دیا۔ اوپر آپ مولانا کا فقرہ پڑھ آئے ہیں جس کے الفاظ صرف یہ ہیں "اگر کوئی ہندوستانی ذبح حیوانات سے بچے" لیکن لائق ناقد معارف میں اس فقرہ کو نقل کرنے کے بعد اپنی طرف سے یہ فقرہ اضافہ کرتے ہیں "یعنی اپنے اوپر حیوانات کا گوشت حرام کرلے"۔ اور پھر ستم یہ ہے کہ اس فقرہ کو مولانا کی عبارت کے ساتھ ضم کر دیتے ہیں۔ اب کوئی بتائے کہ "ذبح حیوانات سے بچنے" کے معنیٰ "اپنے اوپر حیوانات کا گوشت حرام کرلینا" کس زبان اور کس قاعدہ کی رو سے درست ہیں ہم کتنے مسلمان ہیں جنھوں نے طبیعت کی کمزوری کے باعث عمر بھر میں کبھی اپنے ہاتھ سے قربانی یا ایک مرغی بھی ذبح نہ کی ہوگی جس کی وجہ سے ایک عربی شاعر انھیں خطاب کر کے کہہ سکتا ہے۔

کانّ ربک لم یخلق لخشیتہٖ
سواھم من جمیع الناس انسانًا

لیکن کیا اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ یہ لوگ گوشت بھی نہیں کھاتے یا اس کو انھوں نے اپنے لئے حرام کر لیا ہے۔ فشتانِ ما بینھما

ہاں بیشک مولانا فرماتے ہیں۔

"اطعمہ کی تحلیل اور تحریم بیشتر قومی پسندیدگی یا مزاج کے مطابق ہوتی ہے۔" (ص ۲۵۷)

حضرت شاہ صاحبؒ کے مذکورہ بالا بیانات سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ لیکن مولانا کے اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ارشاد کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اب یہاں ہندوستان میں ہندوؤں کی خاطر از سرِ نو تحلیل و تحریم کا فیصلہ کیا جائے کیونکہ اسلامی احکام میں بذاتِ خود اتنی لچک ہے کہ اس کی قطعاً کوئی ضرورت ہی نہیں۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بنو اسرائیل جیسی تنگ نظر نہ تھی جس کی وجہ سے تحلیل میں تنگی برتی جاتی۔ چنانچہ قرآن نے کہا

کل الطعام کان حلاً	تمام کھانے بنو اسرائیل کے لئے حلال تھے سوائے
لبنی اسرائیل الا ما حرم	ان کھانوں کے جن کو خود بنی اسرائیل نے اپنے
اسرائیل علی نفسہ	اوپر حرام کر لیا تھا۔

یہاں جب امتِ محمدیہ نے اپنے اوپر کوئی چیز حرام نہیں کی تو ان پر کیوں سختی کی جاتی۔

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت یعقوبؑ اور ان کی اولاد نے اونٹ کا گوشت اور دودھ اپنے اوپر حرام کر لیا تو خدا نے بھی اسے حرام کر دیا۔ لیکن اس کے برخلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے جلیل القدر پیغمبر نے ایک مرتبہ شہد نہ کھانے کی قسم کھا لی، تو خدا نے اس کو حرام نہیں کیا بلکہ خود حضور کو خطاب کر کے فرمایا

یا ایھا النبی لم تحرم	اے نبی آپ اس چیز کو کیوں حرام کرتے ہیں جس کو
ما احل اللہُ لک	خدا نے آپ کے لئے حلال کیا ہے۔

پھر اتنا ہی نہیں بلکہ آپ سے قسم تڑوائی جاتی ہے اور شہد کھلایا جاتا ہے۔

غور کیجئے! ان دونوں واقعات میں یہ فرق کیوں ہے؟ محض اس وجہ سے کہ بنو اسرائیل کا مذہب صرف ان کے لئے تھا اور اس کے برخلاف اسلام تمام عالم کا مذہب تھا اس میں قدرتی طور پر یہ وسعت اور گنجائش ہونی چاہئے تھی۔

قرآن میں لے دے کے کل دو ہی چیزیں تو حرام ہیں[۱] اور وہ دونوں حسنِ اتفاق سے حرفِ خ سے

---

[۱] ان کے علاوہ قرآن میں جن محرمات کا ذکر ہے وہ یا تو مردار جانور ہے یا وہ زندہ جانور ہے جو غیر طبعی طریقہ پر مرا ہو یا مارا گیا ہو مثلاً موقوذہ نطیحہ اور متردیہ۔ بہرحال ان چیزوں میں حرمت نفس شئے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۱ پر ملاحظہ ہو)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شروع ہوتی ہیں یعنی خمر اور خنزیر۔ ان میں سے موخر الذکر کی نجاست اور خباثت اس درجہ ظاہر و باہر ہے کہ بے شمار انسان جو شراب پیتے ہیں وہ بھی اس ملعون کے پاس پھٹکتے تک نہیں پھر اسلام جب ہر طیب سے طیب اور عمدہ سے عمدہ گوشت کی اجازت دیتا ہے تو اب لحمِ خنزیر پر اصرار کرنا ممسوخ الفطرت ہونے کی دلیل نہیں تو اور کیا ہے۔

رہا خمر کا معاملہ! تو اسلام نے اس کا بدل نبیذ تجویز کیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ کے مشکیزہ سے کچھ پی لیا اور اس کو نشہ ہوگیا تو حضرت عمرؓ اس کو مارنے لگے اب یہ شخص بولا کہ حضرت میں نے آپ کے مشکیزہ سے ہی تو پیا ہے؟" حضرت عمرؓ نے فرمایا "میں پینے کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ نشہ کی وجہ سے مارتا ہوں" سبحان اللہ! حضرت عمرؓ نے کیا بلیغ بات ارشاد فرمائی ہے مقصد یہ ہے کہ مشروب ممنوع نہ تھا لیکن جب پینے والے میں ہی "جرعہ مئے مرد افگن" ہونے کی تاب نہ ہو تو پھر وہ اسے پئے ہی کیوں؟ یعنی اگر شراب دشمن ہوش و حواس ہے تو کون عقلمند اسے گوارا کرے گا کہ وہ چند گھونٹ پی کر اپنے ہوش و حواس کھو دے" گویا اس طرح حضرت عمرؓ نے شراب کی حرمت کی وجہ تو بیان فرمائی ہی تھی ساتھ ساتھ یہ بھی بتا گئے کہ نبیذ حلال تو ہے مگر اس کے لئے جو عمرؓ (رضی اللہ عنہ) جیسا ظرفِ وسیع بھی رکھتا ہو۔

پس مولانا نے تحلیل و تحریم اطعمہ کے سلسلہ میں جو کچھ فرمایا ہے اس کے کسی فقرہ یا کسی لفظ کی زد اسلام پر نہیں پڑتی۔ البتہ مولانا ہندوؤں پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں ا۔

> "ہندوستان میں قدیم الایام سے گائے کا گوشت نہیں کھایا جاتا۔ اس کو ہم کہیں گے کہ گائے کا گوشت ہندو قوم کے مزاج میں مکروہ ہے۔ لیکن زیادتی یہ ہے کہ ہندوؤں نے گائے کے گوشت کو کل انسانیت کے لئے حرام سمجھ لیا۔" (ص ۲۵۷)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۰) ایک خارجی سبب کے باعث ہے یا ان کے علاوہ احادیثِ صحیحہ کی رو سے جو بعض جانور مثلاً درندے وغیرہ حرام ہیں وہ بذاتِ خود اتنی مکروہ اور صحت کے لئے اس درجہ مضر چیزیں ہیں کہ کوئی مہذب اور فہمیدہ انسان ان کو کھانا پسند نہیں کریگا اور نہ وہ کسی متمدن قوم میں کھائی جاتی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن افسوس کہ اس کے باوجودِ گوشت سے متعلق مولانا کا مذکورۂ بالا فقرہ نقل کرنے کے بعد ہمارے لائق ناقد مولانا سندھی کی نسبت ان الفاظ میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

"یہ سب اسی جذبۂ وطن پرستی کے مظاہر ہیں جو مولانا کی رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے ہیں" (معارف ص ۱۷۷)

اب کوئی انصاف کرے کہ یہ "جذبۂ وطن پرستی" کا نتیجہ ہے یا اس جذبہ کا کہ مولانا اسلام کو ہر قوم کے لئے قابلِ قبول مانتے ہیں اور اسلام سے لوگوں کی وحشت کم کرنی چاہتے ہیں

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

خرد کا نام جنوں رکھدیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

(باقی آئندہ)

تصحیح

افسوس ہے برہان کی اشاعتِ گذشتہ میں صفحہ ۲۰۲ سطر ۵ میں عربی کے مصرعہ میں لفظ "من" رہ گیا ہے۔ ازراہِ کرم مصرعہ کو یوں پڑھئے۔

"ببعوا الموالی واستحیوا من العرب"

© rasailojaraid.com